انتظار حسین

پاک ٹی ہاؤس:
چائے کی میز سے فٹ پاتھ تک

اب شام اتر رہی تھی اور پاک ٹی ہاؤس بند پڑا تھا۔ یہ اتوار کی شام تھی۔ اور اتوار کو تخصیص کے ساتھ پاک ٹی ہاؤس میں گہماگہمی ہوا کرتی تھی۔ کتنے زمانے سے حلقۂ اربابِ ذوق سے وابستہ ادیبوں کا طور یہ چلا آرہا تھا کہ وہ دوپہر سے اس کوچے میں آنا شروع کرتے تھے اور حلقے کے جلسے کے وقت تک چائے کی میزیں اچھی خاصی بھر جاتی تھیں۔ کتنی چہک مہک ہوتی تھی۔ اس پر قیّوم نظر کا قہقہہ مستزاد۔ پھر شہرت بخاری رجسٹر بغل میں داب کر اور پانی کا جگ اور ایک گلاس سنبھال کر وائی۔ ایم۔ سی۔ اے۔ کے اس کمرے کی طرف چل پڑتے جہاں حلقے کا جلسہ ہوا کرتا تھا۔ پھر قیوم نظر اپنی پوری منڈلی کو لے کر روانہ ہوتے۔ ٹی ہاؤس بھی تو وائی۔ ایم۔ سی۔ اے۔ کی عمارت ہی کے ایک گوشے میں آباد تھا۔ سو جب وائی۔ ایم۔ سی۔ اے۔ والوں نے بوجوہ اسے دیس نکالا دیا تو اس نے ٹی ہاؤس میں ڈیرا ڈالا۔ مگر آج ٹی ہاؤس بند پڑا تھا اور حلقے کی مخلوق اس کے متّصل فٹ پاتھ پر اور سڑک پر تتّر بتّر تھی۔ پھر حلقے کے سکریٹری صاحب بغل میں کارروائی رجسٹر دابے برآمد ہوے۔ جلد ہی تین شکستہ کرسیاں کہیں سے لا کر فٹ پاتھ پر آراستہ کیں۔ ایک پر صدر صاحب بیٹھے۔ دوسری پر سکریٹری صاحب۔ تیسری پر باری باری مقالہ نگار، افسانہ نگار، اور شاعر کو بیٹھ کر اپنا لکھا سنانا تھا۔ لیجیے حلقے کا جلسہ شروع ہو گیا۔

یہ نقشہ دیکھ کر مجھے ناصر کاظمی کا ایک شعر یاد آیا:

آؤ گھاس پر سبھا جمائیں
میخانہ تو بند پڑا ہے

یہ اس زمانے کا شعر ہے جب مال روڈ پر جس کے ایک نکّڑ پر ٹی ہاؤس آباد تھا گھاس کے

قطعات بہت تھے، اور پھولوں کی کیاریاں، اور شیشم۔ مولسری اور پیپل کے اونچے اونچے پیڑ۔ اور ایک سہ پہر ہم نے اس کوچے میں قدم رکھا تو دیکھا ٹی ہاؤس بند پڑا ہے۔ اس روز کو بھی بڑی ہڑتال ہوئی تھی ورنہ ٹی ہاؤس تو ہڑتالوں کے موسم میں بھی اپنے عقبی دروازے کی راہ چوری چھپے کھلا رہتا تھا۔ سو ہم ٹی ہاؤس کے سامنے سڑک پار والے سبزہ زار پر جا کر پسر گئے۔ وہاں سے اٹھے ہائی کورٹ کے متصل جو گھاس کے قطعے تھے وہاں جا کر نشست جمائی۔ ناصر کو ایک جگہ کہاں قرار آتا تھا۔ سو چائے خانوں کے سلسلے میں بھی یہی طور تھا کہ ٹی ہاؤس میں مدّاحوں اور ہم عصروں کے ہجوم کے بیچ بیٹھے بیٹھے خفقان ہوا۔ سگریٹ خریدنے کے بہانے اٹھا اور باہر نکل گیا۔ باری باری ہم سب یار اٹھتے اور دوسروں کو اس کا احساس دلائے بغیر باہر نکل جاتے۔ ہمیں پتا ہوتا کہ ناصر یا تو کافی ہاؤس کا رخ کرے گا یا اس کے برابر والے چینیز لنچ ہوم میں جا کر بیٹھے گا، یا پھر سامنے جو ڈین ریستوراں تھا وہاں جا کر پسارے گا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے جی اکتایا تو اٹھے، مال روڈ پر چہل قدمی کی اور اگلے کسی ریستوراں میں پڑاؤ کیا۔ ان دنوں پراگندہ طبع لوگوں کے ٹھکانے بہت تھے۔ پاؤں میں چکّر تھا۔ سڑکیں ناپ رہے ہیں ، گلیوں کی خاک پھانک رہے ہیں۔ کبھی اس ریستوراں میں کبھی اس ریستوراں میں۔ ہر پھر کر پھر ٹی ہاؤس میں کہ مستقل ٹھکانا تو یہی تھا۔

اب میں سوچ رہا ہوں کہ میں نے ٹی ہاؤس میں پہلے پہل قدم کب رکھا تھا۔ شاید ۱۹۴۸ کے اوائل میں۔ ابھی ٹی ہاؤس ادیبوں سے اس قدر آباد نہیں تھا جتنا آگے چل کر ہوا۔ تقسیم کو ابھی کونسے ایسے زیادہ دن ہوے تھے۔ سال بھی تو نہیں گزرا تھا۔ تقسیم سے پہلے تو شہر کے ممتاز ادیبوں کا اَڈّا عرب ہوٹل تھا۔ ہوٹل کے نام سے دھوکا مت کھائیے۔ یہ ریلوے روڈ پر اسلامیہ کالج کے بالمقابل ایک چھوٹا سا چائے خانہ تھا جہاں اختر شیرانی، ڈاکٹر تاثیر، مولانا چراغ حسرت، عبد المجید بھٹّی اور کتنے ایسے ادیبوں دانشوروں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ یہی کوچہ شہر کے مسلمانوں کی سیاسی تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ مسلمانوں کی ممتاز درسگاہ بھی یہی تھی۔ ادیبوں کو بھی اسی بیچ اپنا ٹھکانا بنانا تھا۔ مگر تقسیم کے بعد شہر کا نقشہ بدل گیا۔ اس کوچے میں آباد ادیبوں، دانشوروں، سیاسی جانوروں، صحافیوں نے مال روڈ کا رخ کیا۔ وہ چہرے جو پہلے ہر پھر کر اسی کوچے میں دکھائی دیتے تھے اب مال روڈ پر کافی ہاؤس میں، چینیز لنچ ہوم میں، کیفے اورینٹ میں، اور کہاں کہاں درشن دیتے تھے۔

ٹی ہاؤس کے پہلے آبادکار حلقۂ اربابِ ذوق کے لوگ تھے۔ چائے کا ایک دور حلقے کے جلسے میں جانے سے پہلے، ایک دور جلسے سے نبٹنے کے بعد۔ اس دوسرے دور نے تو باقاعدہ ایک رسم کی شکل اختیار کر لی تھی۔ جلسے سے نبٹنے کے بعد حلقے سے وابستہ ادیب یہاں آکر ایک بڑی میز کے گرد بیٹھتے۔ چائے کا دور چلتا اور ایک پلیٹ گردش کرتا دکھائی دیتا۔ جس کی جتنی استطاعت اور جتنی ہمّت ہوتی اس کے حساب سے وہ رقم پلیٹ میں ڈال دیتا۔ کسی نے روپیا ڈالا، کسی نے دو روپے، کسی نے اَٹھنّی۔ یوں چائے کا بِل ادا ہوتا۔ سالانہ اجلاس کے بعد جو بڑی چائے ہوتی تھی اور جس کے ساتھ چاپوں کا اہتمام بھی ہوتا تھا، وہ ٹی ہاؤس کی طرف سے ہوتی تھی۔ ٹی ہاؤس کے مالکان اچھے خاصے فراخ دل واقع ہوے تھے۔ رمضان کی شاموں میں یوں وہ اپنے لیے ہی افطاری کا اہتمام کرتے تھے، مگر افطاری سے سجی ہوئی میز پر ان کے ساتھ ہم میں سے جس کا جی چاہتا جا شامل ہوتا۔ پھانک ادیبوں کے ساتھ خاص رعایت برتی جاتی۔

ابھی ترقی پسند ادیب ٹی ہاؤس سے دور تھے۔ ان کی ہفت روزہ نشستیں دیال سنگھ کالج کی لائبریری میں ہوتی تھیں۔ یعنی میکلوڈ روڈ کے نواح میں۔ میکلوڈ روڈ اصلاً فلم والوں کا کوچہ تھا۔ یہاں کے ریستورانوں میں فلم والے اور فلمی ہیرو بننے کے امید وار کثرت سے نظر آتے تھے۔ انھیں ریستورانوں کو ترقی پسند ادیبوں نے بھی عزت بخشی۔ مگر جب ۱۹۵۱ میں پنڈی سازش کا شگوفہ پھوٹا اور انجمنِ ترقی پسند مصنفین معتوب ٹھہری تو ترقی پسند ادیبوں کی محفلیں برہم ہو گئیں۔ میکلوڈ روڈ کے ریستورانوں میں خالی فلمی مخلوق رہ گئی۔ ترقی پسند کنارہ کر گئے۔ یار ان کی صورتیں دیکھنے کو ترس گئے۔ کتنے جیل چلے گئے۔ پسماندگان میں کوئی یہاں کوئی وہاں۔ پھر کوئی کوئی چہرا ٹی ہاؤس میں نمودار ہوا۔ یوں سمجھئے کہ وہ میکلوڈ روڈ میں غروب ہو کر مناسب وقفے کے بعد ٹی ہاؤس میں طلوع ہوے۔ اور احمد راہی، عارف عبد المتین اور صفدر میر تو جلد ہی یہاں ایسے رچ بس گئے کہ جیسے سدا سے یہیں ان کا ڈیرا تھا۔ یوں ٹی ہاؤس اب ایک مکتبۂ فکر کی جاگیر نہیں رہا۔ رجعت پسند، ترقی پسند دونوں تلواریں ایک میان میں۔ اور ترقی پسندوں کو بھی تو ایسا وہ غرّہ نہیں رہا تھا کہ ادب کے میدان میں بس وہ ہی وہ ہیں۔

ٹی ہاؤس کی آبادی میں معتد بہ اضافہ اس وقت ہوا جب کافی ہاؤس بند ہوا۔ ہاں یہ تو میں بتانا بھول ہی گیا تھا کہ شروع میں یہ انڈیا ٹی ہاؤس تھا اور کافی ہاؤس انڈیا کافی ہاؤس تھا۔ تقسیم کے بعد ایک ڈیڑھ سال تک اسی نام کے ساتھ دونوں کا سکہ چلتا رہا۔ اسی

عرصے میں ہمارے دیکھتے دیکھتے انڈیا ٹی ہاؤس، پاک ٹی ہاؤس بن گیا اور انڈیا کافی ہاؤس نے ذیلن کافی ہاؤس کی حیثیت اختیار کر لی۔ مگر ذیلن کافی ہاؤس نے لمبی عمر نہیں پائی۔ویسے تو وہ بہت شاد باد نظر آتا تھا۔ اور کوئی کوئی تو وہاں اس شان سے بیٹھا تھا کہ موت کا فرشتا ہی آکر اسے یہاں سے اٹھائے تو اٹھے۔ مگر موت کا فرشتا ان سے پہلے ذیلن کافی ہاؤس پر آن وارد ہوا۔ جیسے موت کے ہاتھوں کبھی کبھی کوئی بھرا گھر اجڑ جاتا ہے، اسی طرح سے کافی ہاؤس اجڑا۔

ٹی ہاؤس سے اجڑنے والے وکیل، صحافی، سیاست داں، آرٹسٹ، دانش ور، غرض کس کس کا ذکر کیا جائے۔ کچھ یہاں سے جا کر مال روڈ کے دوسرے کنارے شیزان میں جا آباد ہوے۔ کتنے ہی بے ٹھکانا ہوے۔ کتنوں کو ٹی ہاؤس میں منتقل ہونے میں سہولت نظر آئی۔ ان میں دو خانہ بربادوں کا ذکر لازم نظر آتا ہے۔ ایک ریاض قادر۔ دوسرے نواب ناطق۔ پتھر اپنی جگہ پہ بھاری ہوتا ہے۔ ریاض قادر ٹی ہاؤس کا پتھر تھے۔ وہاں بیٹھے وہ کتنے بھاری نظر آتے تھے۔ صبح دم آتے اور رات کو کافی ہاؤس بند کرا کے رخصت ہو تے۔ دن بھر بولتے رہتے اور دانش کے موتی بکھیرتے رہتے۔ جو ان کی میز پر آ گیا، پھر مشکل ہی سے یہاں سے اٹھ پاتا تھا۔ جو بے صبری دکھاتا، اس سے کہتے کہ صاحب مجھے اپنا فقرہ تو پورا کر لینے دیں۔ اور ریاض قادر کا فقرہ کبھی پورا ہوتے نہیں دیکھا گیا۔ ٹی ہاؤس وہ مستقل آباد ہونے کی نیّت ہی سے آئے تھے۔ مگر انھیں جلد ہی پتا چل گیا کہ ٹی ہاؤس میں ان کی بحالی مشکل ہے۔ کافی ہاؤس کا پتھر کافی ہاؤس سے نکل کر گلی کا روڑا بن گیا۔

یادش بخیر نواب ناطق۔ اپنا سلسلۂ نسب کچھ اس طرح بتاتے تھے کہ مرزا غالب کے بھائی جان کی پڑپوتی کی بیٹی بی کے ہم نورِ نظر ہیں۔ شعر کچھ اس رنگ کے کہتے تھے:

ناطق کہ سخن تیرا ہے تریاق تریہا
امباق تریہا لك بمباق تریہا

ان دنوں ٹی ہاؤس میں نئی لسانی تشکیلات کا غلغلہ تھا۔ اس حوالے سے افتخار جالب اپنا نقّارہ بجا رہے تھے۔ ناطق کے شعر یاروں نے سنے تو انھیں لپك لیا اور افتخار جالب کے مقابلے میں چھوڑا کہ اصلی نئی لسانی تشکیلات تو یہ ہیں۔

اسی ریلے میں حسن لطیفی بھی کافی ہاؤس سے نکلے اور ٹی ہاؤس میں مستقل قیام کی نیّت سے داخل ہوے۔ وہ آئے تو گلی کے چند کتّے بھی ان کے ساتھ ساتھ آئے۔ جب کوئی

نیازمند ان کے لیے چائے کا آڈر دیتا تو وہ دو توس بھی ساتھ منگاتے۔ پہلے وہ یہ دو توس باہر لے جا کر کتّوں کی نذر کرتے۔ پھر واپس آکر اطمینان سے بیٹھتے، چائے پیتے اور اپنی تازہ نظم سناتے۔

کافی ہاؤس کے سب ہی خانہ برباد اپنے اپنے رنگ میں نرالے تھے۔ اپنی اپنی ان کی سنک تھی۔ ٹی ہاؤس کے اپنے سنکی بھی کون سے کم تھے۔ کوئی کوئی سنک سے گزرا اور باقاعدہ دیوانگی کو شعار کیا۔ ڈاکٹر واحد سلیم واحد اچھے بھلے شاعر تھے۔ روز اپنے کلینک سے فارغ ہو کر رات کے آٹھ بجے ٹی ہاؤس پہنچتے اور عارف عبد المتین سے دانشورانہ گفتگو کرتے۔ کسی نے ان کی شان میں ایک قطعہ بھی کہہ رکھا تھا، جو یوں شروع ہوتا تھا:
''آتا ہے شب کو آٹھ بجے ڈاکٹر سلیم۔'' شاعری کے سوا جانے اور کون سی افتاد پڑی کہ دماغ چل بچل ہوگیا۔ بس پھر ٹی ہاؤس چھوڑا، گریباں چاک کیا اور عالمِ دیوانگی میں سڑکوں گلیوں کی خاک چھاننے لگے۔

مگر ذکر ان کا ہو رہا تھا جو کافی ہاؤس کے اجڑنے پر وہاں سے ہجرت کر کے ٹی ہاؤس پہنچے اور یوں ٹی ہاؤس کو ایک دم سے کتنے ہی نرالے نگ میسّر آ گئے۔ مگر جب کافی ہاؤس آباد تھا اس وقت بھی ادھر سے آنے والے یہاں آتے ہی رہتے تھے۔ کافی ہاؤس مخصوص طور پر نئے مصوّروں کی آماج گاہ تھی۔ مگر ان میں ایسے بھی تو تھے جن کا قدم ادب میں بھی تھا۔ انور جلال شمزا اس وقت سمجھو کہ نیم ادیب نیم مصوّر تھے، سو ایک قدم کافی ہاؤس میں دوسرا قدم ٹی ہاؤس میں۔ جب وہ ادب چھوڑ کر پورے مصوّر بنے تو کافی ہاؤس ٹی ہاؤس دونوں سے گزرے اور دیارِ مغرب کی راہ لی۔ ہاں، اور شاکر صاحب۔ انھیں یار پہلے ہی ٹی ہاؤس میں کھینچ لائے تھے۔ اب وہ بالکل ہی ٹی ہاؤس کے ہو رہے۔

ہاں آس پاس کچھ تعلیمی ادارے بھی تو تھے۔ پنجاب یونیورسٹی ، اورینٹل کالج، گورنمنٹ کالج، اسلامیہ کالج (سول لائنز)، میو اسکول آف آرٹس، جو بعد میں نیشنل کالج آف آرٹس بنا، یہ سب آس پاس ہی آباد تھے۔ اوران کے مختلف اساتذہ شاموں کو بالعموم ٹی ہاؤس میں دیکھے جاتے تھے۔ سو ان درس گاہوں میںجس نوجوان کے سر میں ادب کا سودا سما جاتا تھا وہ کبھی اپنے کسی استاد کی انگلی پکڑ کر اور کبھی اپنے ہی طور پر ٹی ہاؤس میں آ پہنچتا تھا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، کہ اورینٹل کالج سے وابستہ تھے، ایک زمانے میں ٹی ہاؤس کے روز کے آنے والوں میں تھے۔ اور گورنمنٹ کالج کے دو استاد قیّوم نظر اور صفدرمیر تو تھے ہی ٹی ہاؤس کے باسی۔ گورنمنٹ کالج کے کتنے نوجوان ان استادوں کی

انگلی پکڑ کر یہاں پہنچے۔

غرض کوئی ایک راستے سے، کوئی دوسرے راستے سے، کوئی اِس بہانے کوئی اُس بہانے یہاں آیا اور جم کر بیٹھ گیا۔ یوں رنگ رنگ کے ادب کے سودائی یہاں جمع ہوتے چلے گئے۔ اکا دکا دیوانہ کہیں باہر سے آیا اور یہاں دھئی دے کر بیٹھ گیا۔ ایک شام ہم آئے تو دیکھا کہ ایک جٹادھاری بزرگ ایک میز پر اپنی پوتھی کھولے بیٹھے ہیں۔ رابندر ناتھ ٹیگور برانڈ کی لمبی سفید ڈاڑھی، اسی انداز کے گیسو۔ پتا چلا کہ یہ دیوندر ستیارتھی ہیں۔ مختصر دورے پر یہاں آئے ہیں۔ مگر قیام لمبا ہوتا چلا گیا۔ جب ٹی ہاؤس میں قدم رکھا دیکھا کہ دیوندر ستیارتھی جی اپنی پوتھی کھولے بیٹھے ہیں۔ اور ہمیں لگا کہ ستیارتھی جی اب یہاں مستقل پسرگئے ہیں۔ ہندوستان واپس جانے کی ان کی کوئی نیّت نہیں ہے۔ اسی کے آگے پیچھے بلراج مینرا آئے اور تھوڑے ہی دنوں میں لگا کہ وہ بھی ٹی ہاؤس میں رچ بس چکے ہیں۔

یوں سمجھئے کہ چالیس کی دہائی کے آخر میں ٹی ہاؤس نے ادبی اڈّے کے طور پر بسنا شروع کیا اور پچاس کی دہائی کے آخر تک ادیبوں سے لبالب بھر چکا تھا۔ اور کیا خوب نقشہ تھا۔ ایک گوشے میں قیّوم نظر حلقے کی امّت کو لیے بیٹھے ہیں۔ ضیا جالندھری، اعجاز بٹالوی، امجد الطاف، شہرت بخاری، انجم رومانی، ریاض احمد۔ اگر یوسف ظفر آن پہنچے تو وہ بھی شامل۔ گفتگو کے موضوعات میراجی، کرکٹ، امانت لکھنوی۔ بیچ بیچ میں قیّوم صاحب کا قہقہہ۔ میراجی تو خیر اب حلقے والوں کے لیے لیجنڈ بن چکے تھے۔ امانت لکھنوی پر گفتگو اس تقریب سے کہ قیّوم صاحب ان دنوں ان پر ریسرچ کر رہے تھے۔ اور کرکٹ کس تقریب سے؟ اس تقریب سے کہ قیّوم صاحب کرکٹ کے رسیا تھے۔ پاک ہند میچ شروع ہوا۔ پھر میراجی طاق میں۔ اب کرکٹ پر گفتگو ہوگی۔

اس سے ہٹ کر ایک اور میز ہے جس پر ناصر کاظمی چہک رہا ہے۔ میر کا مصرعہ ناصر نے پڑھا۔ مظفر علی سید نے اٹھایا۔ شیخ صلاح الدین ابھی گم متھان بنے بیٹھے ہیں۔ جب مغربی ادب پر بات ہوگی تو یہ اپنی باری لیں گے۔ مگر ایذرا پاؤنڈ کو جب وہ ردّ کر دیں گے تو ایک نووارد جوان ہے سعید محمود، وہ ان سے بھڑ جائے گا۔ شاکر صاحب گم سم۔ احمد مشتاق کوئی جلا کٹا فقرہ کہے گا اور پھر چپ ہو جائے گا۔ حنیف رامے نئے نئے ہیں۔ مسیں بھیگ چلی ہیں۔ اپنے خیالوں میں غلطاں۔ انگشتِ شہادت سے فضا میں عورت کا پیکر بنایا اور آنکھیں موند لیں۔ ہاں پچھلے دنوں تک یہاں ایلیٹ پاؤنڈ والی نسل زیرِ بحث تھی۔ اب سارتر اور وجودیت موضوعِ بحث ہیں۔ مظفر نے ایک وجودی نظم بھی لکھ ڈالی ہے۔

اس میز سے ہٹ کر ایک اور میز ہے۔ اس چاہو تو اسلامیہ کالج مکتبۂ فکر کہہ لو اور چاہے مہاجروں کی میز سمجھ لو۔ کچھ اسلامیہ کالج کے پروفیسر کچھ ادھر ادھر کے دانے۔ مگر ایک پروفیسر امین مغل کو چھوڑ کر باقی سب مہاجر۔ چند ے اس میز کو احسان دانش نے بھی رونق بخشی۔ احسان صاحب بیٹھے ہیں اور اپنے کبوتروں کا ذکر کر رہے ہیں: ''وہ کبوتر کمال تھا۔ بلّی کو ایسا پنجہ مارا کہ وہ لہو لہان ہو گئی۔''

''اچھا؟'' سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

''اصل میں میں نے اپنی کبوتری کا جوڑا شکرے سے ملایا تھا۔ جو بچے نکلے تھے، تو وہ کبوتر ہی تھے، مگر پنجے شکرے والے تھے۔''

اس میز کی زینت اسلامیہ کالج کے پروفیسر یوسف جمال انصاری بھی تھے۔ فیض صاحب کو لینن پرائز ملنے کی خبر آئی تو چپ ہو گئے اور پھر پچھتاوے کے لہجے میں بولے: ''بس ہمیں سے چوک ہوگئی۔ ہم نے اپنا مجموعہ نہیں چھپوایا۔''

اسی میز سے ابھی سجاد باقر رضوی اٹھ کر گئے ہیں۔ اب وہ الگ میز پر شاگردوں کو لیے بیٹھے ہیں اور ایلیٹ پر دھواں دھار گفتگو کر رہے ہیں۔

ایک میز پر چند نوخیز اکھٹّے ہیں۔ تازہ واردانِ بساط ہوائے دل۔ یہ گورنمنٹ کالج سے یہاں وارد ہوے ہیں۔ اور نئی شاعری کا عَلم بلند کیے ہوے ہیں۔ انھیں میں جیلانی کامران بھی نظر آئیں گے اور اختر احسن بھی۔ آگے چل کر کچھ دماغوں میں ایک نیا کیڑا کلبلائے گا اور وہ نئی لسانی تشکیلات کا جھنڈا لہرائیں گے۔

ایسے بھی تھے جو ٹی ہاؤس کی کسی باقاعدہ میز کا حصہ نہیں تھے۔ مگر ٹی ہاؤس میں ان کے جھنڈے گڑے ہوے تھے۔ جیسے منیر نیازی اور صفدر میر۔ ان دنوں منیر نیازی کا غصہ مشہور تھا۔ غصیلے تو صفدر میر بھی غضب کے تھے۔ گھڑی میں رن میں گھڑی میں بن میں۔ ابھی قہقہہ لگایا تھا اور اب اچانک لال پیلے ہو رہے ہیں، منہ سے انگارے اگل رہے ہیں۔

اس فضا میں تھوڑی درہمی ایوب خاں کے مارشل لا نے پیدا کی۔ پھر ستمبر ۱۹۶۵ کی جنگ نے۔ اور اعلانِ تاشقند کے بعد سے تو فضا بدلتی ہی چلی گئی۔ سمجھو کہ فضا ادبی سے سیاسی ہوتی چلی گئی۔ ایوب خاں کے خلاف جلوس مال روڈ پر نکلتے تھے۔ ان کی گونج ٹی ہاؤس میں سنائی دیتی تھی۔ حبیب جالب نے پہلے سیاسی جلسوں میں اپنی شاعری کا لوہا منوایا۔ پھر ٹی ہاؤس میں آکر انقلابی شاعری کا ڈنکا بجایا۔ پھر جلد ہی انقلابی دانشوروں کی ایک ٹولی کوس لمن الملکی بجاتی ٹی ہاؤس میں داخل ہوئی اور

دیکھتے دیکھتے حلقۂ اربابِ ذوق میں دندنانے لگی۔ چینی برانڈ انقلابیوں کی اس ٹولی سے نظریاتی رشتہ قایم کر کے انور سجاد حلقے کے سکریٹری بنے۔

حلقے میں یہ طرفہ انقلاب آنے کے بعد انجم رومانی نے ٹی ہاؤس میں کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ اصلی حلقہ تو ہم ہیں۔ حبیب جالب نے ان کی تائید کی۔ یوں ٹی ہاؤس میں حلقے کے پرانے اراکین کے ہاتھوں ۱۹۷۱ میں حلقۂ اربابِ ذوق نئے سرے سے معرضِ وجود میں آیا جو آگے چل کر حلقۂ اربابِ ذوق ادبی کہلایا بمقابلہ حلقۂ اربابِ ذوق سیاسی۔ اس حلقے نے ٹی ہاؤس میں اپنی ہفتہ وار نشستیں منعقد کرنی شروع کیں۔ اب سے پہلے شاید کبھی ٹی ہاؤس میں کوئی جلسہ نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد یہاں جلسے بھی ہونے لگے۔ مثلاً آگے چل کر اسی ٹی ہاؤس میں مبارک احمد نے پوئٹری فورم کی بنیاد رکھی اور اپنے آپ کو اردو میں نثری نظم کے بانی ہونے کا اعلان کیا۔ پھر جب ضیاء الحق کے زمانے میں بائیں بازو کے دانشوروں پر زمین تنگ ہوئی اور یومِ مئی منانے کے لیے انھیں کوئی جگہ میسر نہ آئی تو انھوں نے ٹی ہاؤس کا رخ کیا۔ یوں یہاں یومِ مئی بھی سال کے سال منعقد ہونے لگا۔

ضیاء الحق کے زمانے میں آ کر ٹی ہاؤس کا رنگ اور سے اور ہو گیا۔ ادبی بحثیں یکسر موقوف۔ کہاں کی رباعی، کہاں کی غزل۔ ذہنوں میں تو ضیاء الحق کی پھانس رڑک رہی تھی۔ ہر پھر کر اسی حوالے سے بحثیں، قیاس آرائیاں، افواہیں، پیشگوئیاں۔ سیاسی مبصّر تو بہت جلدی اپنا اعتبار کھو بیٹھے۔ مگر پیشگوئیاں کرنے والوں نے یہاں بیٹھ کر کچھ اس رنگ سے ضیاء الحق کی رخصتی کی پیشگوئیاں کیں کہ ان پر اعتبار لشٹم پشٹم چلتا رہا۔ اور اس زمانے میں تو ٹی ہاؤس کے بیٹھنے والے اچھے خاصے نجومی نظر آتے تھے۔ جنھیں نجوم میں درک نہیں تھا، ان کی مٹھی میں افواہیں ہوتی تھیں۔

ٹی ہاؤس میں چہرے بھی اب مختلف نظر آتے تھے۔ جنھیں بس ادب کی دھن رہتی تھی وہ چہرے اوجھل ہو گئے۔ جن کی اب ریل پیل تھی ان کے یہاں ادب کا غم کم کم تھا۔ اب غم اور طرح کے تھے۔ انھیں غموں کے حساب سے ادب کو بھی دیکھا جا رہا تھا۔ سو اب ٹی ہاؤس میں ادب کہ بات بھی ہوتی تھی تو بس مزاحمتی ادب کے حوالے سے۔ ٹی ہاؤس کی اسپیشل پراڈکٹ اس زمانے میں یہی مزاحمتی ادب تھا۔ اس وقت تو اس ادب کی صورت یہ تھی کہ نیکی کر دریا میں ڈال۔ بے نظیر کے اقتدار سنبھالنے پر پتا چلا کہ ٹی ہاؤس میں اور ٹی ہاؤس سے باہر یہ نیکی منوں ٹنوں کے حساب سے دریا میں ڈالی گئی تھی۔ اور اب اس کے ترنے کا وقت تھا۔ جس نے جتنا مزاحمتی ادب پیدا کیا تھا اس کے حساب سے اسے دیا گیا۔

جیسے تیسے ضیاء الحق کا دور تمام ہوا۔ ملک میں جمہوریت واپس آگئی مگر ٹی ہاؤس میں ادب واپس نہیں آیا۔ خیر جمہوریت جیسی واپس آئی اس سے تو توبہ ہی بھلی۔ ٹی ہاؤس میں بھی کچھ واپسیاں تو ہوئیں۔ مثلاً حلقۂ اربابِ ذوق واپس آگیا۔ مگر گم شدہ ادبی فضا واپس نہیں آئی۔ ادبی بحثیں واپس نہیں آئیں۔ بحثیں اب اس حوالے سے ہوتی نظر آتی تھیں کہ تمغۂ حسن کارکردگی کسے ملا اور کسے ملنا چاہیے تھا۔ یا یہ کہ کس ادیب کو کس ادارے کی سربراہی عطا ہوئی ہے اور جائز طور پر کسے عطا ہونی چاہیے تھی۔ ٹی ہاؤس سے وابستگی میں بھی اب بہت فرق آگیا تھا۔ آگے تو یہ نقشہ تھا کہ صبح دوپہر شام جب ٹی ہاؤس میں جھانکو ادیبوں کی ٹولیاں بیٹھی نظر آتی تھیں۔ دن کے اوقات میں کم، شام کے اوقات میں زیادہ۔ اور یہ کہ جو آتے تھے وہ بہت پابندی کے ساتھ آتے تھے۔ اب دن کے اوقات میں ادبی مخلوق یہاں مشکل سے نظر آتی تھی۔ شام کے اوقات میں بھی پابندی سے آنے کا رواج جاتا رہا۔ چھنٹ چھنٹا کر دو نگ ایسے رہ گئے جو پابندی سے آتے دیکھے گئے۔ زاہد ڈار اور اسرار زیدی۔ انھوں نے بھی اب اپنے اوقات مقرر کر لیے تھے۔ گزرے دور میں آنے جانے کو اوقات کہاں مقرر تھے۔ سر پھرے وقت بے وقت یہاں بیٹھے نظر آتے تھے۔ اب ادیبوں کی ٹی ہاؤس سے باہر مصروفیات بہت بڑھ گئیں تھیں۔

صبح کے اوقات کی نشست زاہد ڈار کی بدولت کم از کم ایک میز پر خاصی مدّت جاری رہی۔ پھر زاہد ڈار کا طور بھی آخر کے تئیں یہی ٹھہرا کہ شام کو وقتِ مقررہ پر کتاب در بغل آنا اور وقتِ مقررہ پر اٹھ جانا۔ آخر آخر میں ادیبوں کی جتنی بھی دھما چوکڑی ہونی ہوتی اتوار کی شام کو ہوتی۔

حلقۂ اربابِ ذوق کی واپسی کا احوال اس طرح ہے کہ ضیاء الحق کے دور میں حلقۂ اربابِ ذوق ادبی اور حلقۂ اربابِ ذوق سیاسی دونوں ہی کو اپنی بساط لپیٹنی پڑی تھی۔ لمبے عرصے کے بعد مارشل لا کے اختتام پر جب مبارک احمد نے جھرجھری لی اور حلقے کی تجدید پر کمر باندھی تو سیاسی حلقے اور ادبی حلقے کی تنا تنی بھی ان کی بساط لپٹنے کے ساتھ ختم ہو گئی تھی۔ مبارک احمد نے کس سہولت کے ساتھ حلقے کی تجدید کی اور اس کے جلسے ٹی ہاؤس کی بالائی منزل میں شروع کردیے۔ مگر وے صورتیں الٰہی کس دیس جا بسیں جن کے دم سے حلقہ ایک زندہ ادبی ادارہ نظر آتا تھا۔ اب یہاں مستقل آنے والوں میں سب سے نمایاں سب سے ممتاز خان فضل الرحمٰن خاں تھے کہ ٹی ہاؤس میں داخل ہو کر پہلے فریضۂ نماز بجا لاتے پھر حلقے کے جلسے میں شریک ہوتے اور وہاں اسلام کا عَلم بلند

کرتے۔ ٹی ہاؤس اب سے پہلے صرف روزہ داروں سے آشنا تھا۔ حلقے کے دو پکّے روزہ دار انجم رومانی اور شہرت بخاری تھے۔ رمضان کے ایّام میں اور شاموں کو آتے یا نہ آتے اتوار کو حلقے کی تقریب سے آنا ضرور تھا۔ انجم رومانی ایک ٹماٹر جیب میں ڈال کر یہاں آتے۔ حلقے کے جلسے میں جانے سے پہلے وہ ٹماٹر بیرے کے سپرد کرتے۔ افطار کا وقت تو حلقے ہی میں ہو جاتا۔ وہاں کھجور سے روزہ افطار کرتے۔ واپس جب ٹی ہاؤس آتے تو اس ایک ٹماٹر کا سوپ انھیں تیار ملتا۔ خان فضل الرحمٰن خاں کے آنے سے ٹی ہاؤس میں صلوٰۃ قایم ہوئی اور حلقے میں اسلام کا بول بالا ہوا۔ حلقے کے ایک جلسے میں ٹالسٹائی کے ذکر پر انھوں نے یہی سوال اٹھایا تھا کہ اگر ٹالسٹائی واقعی بڑا ادیب تھا تو پھر مشرّف بہ اسلام کیوں نہیں ہوا۔ ہوتے ہوتے نوبت یہ آئی کہ ایک سبز پگڑی والی شخصیت ٹی ہاؤس میں نمودار ہوئی۔ دو تین دن تک وہ دور کی میز سے زاہد ڈار کو گھورتی رہی۔ پھر ایک شام زاہد ڈار کے بالمقابل آ بیٹھی اور یوں گویا ہوئی: ''آپ نماز نہیں پڑھتے۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ آپ نماز پڑھا کیجیے۔''

زاہد ڈار نے کتاب پڑھتے پڑھتے اسے دیکھا اور کہا: ''میں نے تو آپ کو دعوت نہیں دی تھی۔ آپ کس خوشی میں یہاں بلا تکلف آن بیٹھے ہیں۔''

اس مردِ مسلمان نے برجستہ کہا، ''محمد بن قاسم کو کفرستانِ ہند میں آنے کی کس نے دعوت دی تھی۔''

زاہد ڈار اس جواب پر کھیل گیا۔ اس نے کتاب بغل میں دابی اور میز سے اٹھ باہر فٹ پاتھ پہ جا کھڑا ہوا۔

ویسے یوں یاروں کی میز پر کسی اجنبی کا بلا تکلف آ بیٹھنا ٹی ہاؤس میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس قسم کی بے تکلفی ٹی ہاؤس کی روایت کا حصہ رہی ہے۔ یہاں بن بلائے مہمانوں سے کبھی کوئی میز محفوظ نہیں پائی گئی۔ ہمیں تو احمد مشتاق اور شیخ صلاح الدین کی انتہا درجے کی بے مروتی نے اس ناخوشگوار صورتِ حال سے بچا رکھا تھا۔ بے مروت تو زاہد ڈار بھی پرلے درجے کا ہے۔ مگر پرلے درجے کے ڈھیٹ بھی تو ہوتے ہیں۔ اس لیے وقتاً فوقتاً یہ دیکھنے میں آیا کہ زاہد ڈار نے اپنی میز آنے والے مہمان کے حوالے کی اور خود باہر فٹ پاتھ پر جا کھڑا ہوا۔

پچھلے ایک ڈیڑھ سال کو ٹی ہاؤس کے آخری ایام جاننا چاہیے۔ چراغ کا آخری سنبھالا۔ اتوار کی شاموں کو کچھ زیادہ ہی گہما گہمی نظر آتی تھی۔ اور نئی بات یہ دیکھنے

میں آرہی تھی کہ ٹی ہاؤس میں‌مصنف تیزی سے پیدا ہوتے جا رہے تھے۔ ہر اتوار کو نئی تصانیف اہلِ ٹی ہاؤس کے بیچ تقسیم ہوتی نظر آتی تھیں۔ کوئی اتوار ایسی نہیں گزری کہ یہاں دو تین نئی تصانیف مجھے موصول نہ ہوئی ہوں۔ ایک شام یہ منظر دیکھا کہ ایک صاحب اس شان سے داخل ہوے کہ پیچھے پیچھے ملازم سر پر ایک گٹھر اٹھائے ہوے۔ وہ گٹھر انھوں نے ایک میز پر رکھوایا۔ اسے کھولا۔ یہ ان کی اپنی نئی کتاب کا گٹھر تھا۔ ایک ایک کتاب سب کے ہاتھ میں تھمائی۔ پھر دامن جھاڑا اور باہر نکل گئے۔

مگر باہر دنیا بدلتی چلی جا رہی تھی۔ مال روڈ پر ٹی ہاؤس سے قریب و دور جتنے ریستوراں تھے وہ ایک ایک کر کے بند ہو گئے تھے۔ ٹی ہاؤس کے قرب و جوار میں کافی ہاؤس کی خستۂ و بوسیدہ مقفل عمارت سے لے کر ٹی ہاؤس کے فٹ پاتھ تک موٹروں کے ٹائر تہہ در تہہ چنے نظر آتے تھے۔ اب یہ علاقہ موٹر ٹائروں کے کاروبار کا علاقہ بن چکا تھا۔ اور ادیبوں کی آنکھوں پر ایسے پردے پڑے ہوے تھے کہ وہ ٹی ہاؤس کے متصل فٹ پاتھ پر ٹائر سجے دیکھتے تھے اور پھر بھی انھیں نظر نہیں آیا کہ خطرہ ٹی ہاؤس کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ آخر ایک روز گولر کا پیٹ پھٹا اور یہ خبر وحشت اثر ٹی ہاؤس کی میزوں پر گردش کرنے لگی کہ اب یہاں ٹائروں کی دکان کھلے گی۔ اس خبر سے سمجھو کہ ٹی ہاؤس میں بھونچال آگیا۔ احتجاج۔ مالک کی خوشامدیں۔ اخباری بیانات۔ کالم۔ لیکن سب بے اثر۔

اب میں اس شام کو یاد کرتا ہوں جب ہم نے ٹی ہاؤس میں آخری چائے پی تھی۔ وہ سنیچر کا دن تھا۔ اتوار کا انتظار نہیں‌کیا جا سکتا تھا۔ ٹی ہاؤس کا کوئی اعتبار نہیں تھا۔ صبح بند ہوا یا شام بند ہوا۔ ہم یاروں نے فون پر ایک دوسرے سے بات کی، وقت طے کیا اور شام کو ٹی ہاؤس جا پہنچے۔

''یہ آج ہم ٹی ہاؤس میں شاید آخری چائے پی رہے ہیں،'' میں نے کہا۔

''آخری چائے نہیں۔ لاسٹ سَپر (Last Supper) کہو،'' مسعود اشعر نے ٹکڑا لگایا۔

اسی آن بی۔ بی۔ سی۔ کی ٹیم کیمروں سے لدی پھندی آن پہنچی۔ شاید ٹی ہاؤس کو اسی گھڑی کا نتظار تھا۔ ٹی ہاؤس نے آخری سانس بی۔ بی۔ سی۔ کے کیمرے کی چکا چوند میں لیے: ''پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔''

اگلے دن ٹی ہاؤس نہیں کھلا۔ مگر حلقے والوں نے زمین پکڑی تھی۔ انھوں نے اپنا جلسہ ٹی ہاؤس کے متصل فٹ پاتھ پر کیا۔ یہ اتوار کی شام تھی۔ سڑک خاموش تھی۔ اور فٹ پاتھ پر بھی ٹائر نہیں سجے تھے کہ ٹائروں کی دکانیں بند تھیں۔ پھر حلقے والے اتوار کی اتوار

اپنے جلسے فٹ پاتھ ہی پر کرنے لگے۔ وہ ٹی ہاؤس کے در سے سرکنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ آج ترقی پسند ادیب زندہ ہوتے تو کتنے خوش ہوتے: ادب فٹ پاتھ پر پہنچ کر عوام کے کتنے قریب پہنچ چکا تھا! خاص طور پر انقلابی نوجوانوں کہ وہ ٹولی یاد آئی جو ۱۹۷۰ کی دہائی کے آخری برسوں میں اس قسم کے خواب لے کر حلقے میں داخل ہوئی تھی۔ وہ ٹولی اب کہاں باقی رہ گئی تھی۔ رہ گئے ایک انور سجاد تو انھوں نے بھی ابھی پچھلے دنوں سوشلزم سے تائب ہو کر نظامِ محمدی کا نعرہ لگا یا اور علامہ طاہر القادری کے ہاتھ پر بیعت کر کے ان کی تنظیم میں بھرتی ہو گئے۔ ہاں شاہد محمود ندیم، کہ اس ٹولی کی باقیات الصالحات ہیں، ان کے کان میں بھنک پڑی تو اپنی قوال پارٹی کو لے کر آن موجود ہوے اور حلقے کے جلسے میں سچ مچ عوامی رنگ پیدا کر دیا۔

حلقے والے اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہیں۔ ان کا ایمان ہے کہ ٹی ہاؤس ایک روز ضرور کھلے گا۔